لحاف

اور دیگر افسانے

عصمت چغتائی

ساقی بک ڈپو، دہلی

LIHAF AUR DIGAR AFSANE (Short Stories)
By.: **ISMAT CHUGTAI**
1st. Edition : 2002
Price : Rs. 150-00

ISBN : 81-85772-37-1

نام کتاب : لحاف اور دیگر افسانے (افسانوی مجموعہ)
مصنف : عصمت چغتائی
مرتبہ : عبدالغنی
اشاعت اول : ۲۰۰۲ء
صفحات : ۲۵۶
کمپوزنگ : رہبر کمپیوٹرز، ترکمان گیٹ، دہلی۔۶
طابع : رہبر آفسیٹ پرنٹرز، ترکمان گیٹ، دہلی۔۶
قیمت : =/۱۵۰ روپے

ناشر
ساقی بک ڈپو
4157-A، اردو بازار، دہلی۔110006

Published by :
SAQI BOOK DEPOT
4157A, URDU BAZAR, DELHI-110006

UNIVERSITY LIBRARY

ترتیب

عصمت چغتائی ایک نظر میں	۵
عصمت چغتائی کے افسانے — سعادت حسن منٹو	۷
عصمت چغتائی ناقدین کی نظر میں	۱۵
لحاف	۱۷
دو ہاتھ	۲۹
بھول بھلیاں	۴۱
چوتھی کا جوڑا	۵۹
پیشہ	۷۷
امر بیل	۹۱
چٹان	۱۰۵
تاریکی	۱۲۳
تل	۱۳۱
پنکچر	۱۴۷
گیندا	۱۶۵
ننھی کی نانی	۱۷۹

یہ بے تعلق خارجیت واقعی ایک معجزہ ہے۔

- مجنوں گور کھپوری

یہ ہمارے ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے صنف نازک میں سے ایک ایسی لکھنے والی میسر آئی جس نے نہ صرف اس روایتی بناوٹ اور تکلف اور خوف کو یکسر دور کر دیا جس نے اس طبقے کی روح کو دبا رکھا تھا بلکہ اپنی ژرف نگاہی اور حق پرستی سے ہمیں انسانی فطرت کی ان نازک اور لطیف ترین کیفیتوں سے آشنا ہونے میں مدد دی جن تک تیز سے تیز مرد صاحبِ قلم کی رسائی محال نظر آتی ہے۔

- مولانا صلاح الدین

انسانی شعور کے نازک ارتعاشات کو لفظوں کے ذریعے گرفت میں لے آنے کی جیسی صلاحیت عصمت میں تھی ویسی کسی اور افسانہ نگار میں نہ تھی۔

- محمد حسن عسکری

میرے خیال میں عصمت چغتائی کی خوب صورت زبان کا بڑا راز یہی ہے کہ انھوں نے ایک خاص طبقہ کی لڑکیوں کا مخصوص "محاورہ" سلیقے سے تحریر میں منتقل کیا ہے۔ وہ عام طور سے وہی توتلی سی اتراتی ہوئی زبان لکھتی ہیں جنھیں اکثر نے سنا ہے، بیشتر نے تصور کیا ہے اور سبھی (اجنبی ہونٹوں سے) سننے کی حسرت رکھتے ہیں۔

- فیض احمد فیض

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اردو کی بہترین کہانیاں کون سی ہیں تو میں بلا جھجک "چوتھی کا جوڑا" کا انتخاب ان کہانیوں میں کروں گا۔ "چوتھی کا جوڑا" ایک لڑکی کی حرماں نصیبی کا بیان نہیں ہے، یہ ایک پوری نسل کا المیہ ہے۔

- خواجہ احمد عباس

ان کے بیشتر افسانے سماجی اور جنسی حقیقت نگاری کی بہترین مثال قرار دئے جاسکتے ہیں..... عصمت چغتائی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ان مسائل کو ایک عورت کی حیثیت سے دیکھنے، سمجھنے اور پیش کرنے کی شاندار روایت قائم کی۔

- ڈاکٹر صادق

لحاف

جب میں جاڑوں میں لحاف اوڑھتی ہوں تو پاس کی دیوار پر اس کی پرچھائیں ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ایک دم سے میرا دماغ بیتی ہوئی دنیا کے پردوں میں دوڑنے بھاگنے لگتا ہے۔ نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا ہے۔

معاف کیجئے گا، میں آپ کو خود اپنے لحاف کا رومان انگیز ذکر بتانے نہیں جارہی ہوں نہ لحاف سے کسی قسم کا رومان جوڑا ہی جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں کمبل کم آرام دہ سہی مگر اس کی پرچھائیں اتنی بھیانک نہیں ہوتی جتنی..... جب لحاف کی پرچھائیں دیوار پر ڈگمگا رہی ہو۔ یہ جب کا ذکر ہے جب میں چھوٹی سی تھی اور دن بھر بھائیوں اور ان کے دوستوں کے ساتھ مار کٹائی میں گزار دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ میں کم بخت اتنی لڑاکا کیوں تھی۔ اس عمر میں جب کہ میری اور بہنیں عاشق جمع کر رہی تھیں، میں اپنے پرائے ہر لڑکے اور لڑکی سے جوتم پیزار میں مشغول تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اماں جب آگرہ جانے لگیں تو ہفتہ بھر کے لیے مجھے اپنی ایک منھ بولی بہن کے پاس چھوڑ گئیں۔ ان کے یہاں، اماں خوب جانتی تھیں، کہ چوہے کا بچہ بھی نہیں اور میں کسی سے بھی لڑ بھڑ نہ سکوں گی۔ سزا تو خوب تھی میری! ہاں تو اماں مجھے بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ وہی بیگم جان جن کا لحاف اب تک میرے ذہن میں گرم لوہے کے داغ کی طرح محفوظ ہے۔ یہ وہ بیگم جان تھیں جن کے غریب ماں باپ نے نواب صاحب کو اس لیے داماد بنالیا کہ گو وہ "پکی" عمر کے تھے مگر تھے

نہایت نیک۔ کبھی کوئی رنڈی یا بازاری عورت ان کے یہاں نظر نہ آئی۔ خود حاجی تھے اور بہتوں کو حج کرا چکے تھے۔

مگر انھیں ایک نہایت عجیب و غریب شوق تھا۔ لوگوں کو کبوتر پالنے کا جنون ہوتا ہے، بٹیریں لڑاتے ہیں، مرغ بازی کرتے ہیں۔ اس قسم کے واہیات کھیلوں سے نواب صاحب کو نفرت تھی۔ ان کے یہاں تو بس طالب علم رہتے تھے۔ نوجوان، گورے گورے پتلی کمروں کے لڑکے جن کا خرچ وہ خود برداشت کرتے تھے۔

مگر بیگم جان سے شادی کر کے تو وہ انھیں کُل ساز و سامان کے ساتھ ہی گھر میں رکھ کر بھول گئے۔ اور وہ بچاری دُبلی پتلی نازک سی بیگم تنہائی کے غم میں گھلنے لگیں۔

نہ جانے ان کی زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے جب وہ پیدا ہونے کی غلطی کر چکی تھیں۔ یا وہاں سے جب وہ ایک نواب کی بیگم بن کر آئیں اور چھپر کھٹ پر زندگی گزارنے لگیں۔ یا جب سے نواب صاحب کے یہاں لڑکوں کا زور بندھا۔ ان کے لیے مرغن حلوے اور لذیذ کھانے جانے لگے اور بیگم جان دیوان خانوں کی دراڑوں میں سے ان کے لچکتی کمروں والے لڑکوں کی چست پنڈلیاں اور معطر باریک شبنم کے کرتے دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگیں۔

یا جب سے، جب وہ منتوں مرادوں سے ہار گئیں، حِلے بندھے اور ٹوٹکے اور راتوں کی وظیفہ خوانی بھی چت ہو گئی۔ کہیں پتھر میں جونک لگتی ہے؟ نواب صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر بیگم جان کا دل ٹوٹ گیا اور وہ علم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ لیکن یہاں بھی انھیں کچھ نہ ملا۔ عشقیہ ناول اور جذباتی اشعار پڑھ کر اور بھی پستی چھا گئی۔ رات کی نیند ہاتھ سے گئی اور بیگم جان، جی جان چھوڑ کر بالکل ہی یاس و حسرت کی پوٹ بن گئیں۔

چولھے میں ڈالا تھا، ایسا کپڑا التا۔ کپڑا پہنا جاتا ہے کسی پر رعب گانٹھنے کے لیے۔ اب نہ تو نواب صاحب کو فرصت کہ شبنمی کرتوں کو چھوڑ کر ذرا ادھر توجہ کریں اور نہ وہ انھیں کہیں آنے جانے دیتے۔ جب سے بیگم جان بیاہ کر آئی تھیں رشتہ دار آ کر

مہینوں رہتے اور چلے جاتے۔ مگر وہ بچاری قید کی قید رہتیں۔

ان رشتہ داروں کو دیکھ کر اور بھی ان کا خون جلتا تھا کہ سب کے سب مزے سے مال اُڑانے، عمدہ گھی نگلنے، جاڑے کا ساز و سامان بنوانے آن مرتے اور وہ باوجود نئی روئی کے لحاف کے پڑی سردی میں اکڑا کرتیں۔ ہر کروٹ پر لحاف نئی نئی صورتیں بنا کر دیوار پر سایہ ڈالتا، مگر کوئی بھی سایہ ایسا نہ تھا جو انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہو۔ مگر کیوں جئے پھر کوئی؟۔۔۔ زندگی! بیگم جان کی زندگی جو تھی۔ جینا بدا تھا نصیبوں میں، وہ پھر جینے لگیں اور خوب جئیں!

ربّو نے انھیں نیچے گرتے گرتے سنبھال لیا۔ چٹ پٹ دیکھتے دیکھتے اُن کا سُوکھا جسم بھرنا شروع ہوا۔ گال چمک اُٹھے اور حسن پھوٹ نکلا۔ ایک عجیب و غریب تیل کی مالش سے بیگم جان میں زندگی کی جھلک آئی۔ معاف کیجئے گا اس تیل کا نسخہ آپ کو بہترین سے بہترین رسالے میں بھی نہ ملے گا۔

-x-x-

جب میں نے بیگم جان کو دیکھا تو وہ چالیس بیالیس کی ہوں گی۔ اُفوہ کس شان سے وہ مسند پر نیم دراز تھیں اور ربّو اُن کی پیٹھ سے لگی بیٹھی کمر دبا رہی تھی۔ ایک اُودے رنگ کا دوشالہ اُن کے پیروں پر پڑا تھا اور وہ مہارانی کی طرح شاندار معلوم ہو رہی تھیں۔ مجھے اُن کی شکل بے انتہا پسند تھی۔ میرا جی چاہتا تھا گھنٹوں بالکل پاس سے ان کی صورت دیکھا کروں۔ ان کی رنگت بالکل سفید تھی۔ نام کو سرخی کا ذکر نہیں۔ اور بال سیاہ اور تیل میں ڈوبے رہتے تھے۔ میں نے آج تک اُن کی مانگ بھی بگڑی نہ دیکھی۔ کیا مجال جو ایک بال ادھر اُدھر ہو جائے۔ اُن کی آنکھیں کالی تھیں اور بھوؤں پر کے زائد بال علیحدہ کر دینے سے کمانیں سی کھنچی ہوئی تھیں۔ آنکھیں ذرا تنی ہوئی رہتی تھیں۔ بھاری بھاری پھولے ہوئے پپوٹے، موٹی موٹی پلکیں، سب سے زیادہ جو ان کے چہرے پر حیرت انگیز، جاذب نظر چیز تھی، وہ ان کے ہونٹ تھے۔ عموماً وہ سرخی سے رنگے رہتے تھے۔ اُوپر کے ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں سی تھیں اور کنپٹیوں پر لمبے

لمبے بال۔ کبھی کبھی اُن کا چہرہ دیکھتے دیکھتے عجیب سا لگنے لگتا تھا۔ کم عمر لڑکوں جیسا!

اُن کے جسم کی جلد بھی سفید اور چکنی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے کس کر ٹانکے لگا دیئے ہوں۔ عموماً وہ اپنی پنڈلیاں کھجانے کے لیے کھولتیں تو میں چپکے چپکے اُن کی چمک دیکھا کرتی۔ اُن کا قد بہت لمبا تھا اور پُر گوشت ہونے کی وجہ سے وہ بہت ہی لمبی چوڑی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن بہت متناسب اور ڈھلا ہوا جسم تھا۔ بڑے بڑے چکنے اور سفید ہاتھ اور سڈول کمر۔ تو ربّو ان کی پیٹھ کھجایا کرتی تھی یعنی گھنٹوں اُن کی پیٹھ کھجاتی۔ پیٹھ کھجوانا بھی زندگی کی ضرورت میں سے تھا بلکہ شاید ضروریات زندگی سے بھی زیادہ۔

ربّو کو گھر کا اور کوئی کام نہ تھا۔ بس وہ سارے وقت ان کے چھپر کھٹ پر چڑھی کبھی پیر، کبھی سر اور کبھی جسم کے دوسرے حصّوں کو دبایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو میرا دل بولا اٹھتا تھا۔ جب دیکھو ربّو کچھ نہ کچھ دبا رہی ہے یا مالش کر رہی ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا، تو نہ جانے کیا ہوتا، میں اپنا کہتی ہوں، کوئی اتنا چھوئے بھی تو میرا جسم تو سڑ گل کے ختم ہو جائے۔

اور پھر یہ روز روز کی مالش کافی نہیں تھی۔ جس روز بیگم جان نہاتیں.....یا اللہ بس دو گھنٹے پہلے سے تیل اور خوشبودار اُبٹنوں کی مالش شروع ہو جاتی۔ اور اتنی ہوتی کہ میرا تو تصوّر سے ہی دل ٹوٹ جاتا۔ کمرے کے دروازے بند کر کے انگیٹھیاں سُلگتیں اور چلتا مالش کا دور۔ عموماً صرف ربّو ہی رہتی۔ باقی کی نوکرانیاں بڑبڑاتی دروازے پر سے ہی ضروریات کی چیزیں دیتی جاتیں۔

بات یہ تھی کہ بیگم جان کو کھجلی کا مرض تھا۔ بچاری کو ایسی ہی کھجلی ہوتی تھی کہ ہزاروں تیل اور اُبٹنے ملے جاتے تھے مگر کھجلی تھی کہ قائم۔ ڈاکٹر حکیم کہتے، کچھ بھی نہیں۔ جسم صاف چٹ پڑا ہے۔ ہاں کوئی جلد کے اندر بیماری ہو تو خیر۔ ''نہیں بھئی یہ ڈاکٹر تو ہوئے ہیں پاگل، کوئی آپ کے دشمنوں کو مرض ہے؟ اللہ رکھے خون میں گرمی ہے۔'' ربّو مسکرا کر کہتی اور مہین مہین نظروں سے بیگم جان کو گھورتی۔ اور

یہ ربو..... جتنی یہ بیگم جان گوری تھیں اتنی ہی یہ کالی۔ جتنی بیگم جان سفید تھیں اُتنی ہی یہ سرخ۔ بس جیسے تپایا ہوا لوہا۔ ہلکے ہلکے چیچک کے داغ۔ گٹھا ہوا ٹھوس جسم۔ پھُرتیلے چھوٹے چھوٹے ہاتھ۔ کسی ہوئی چھوٹی سی توند، بڑے بڑے پھولے ہوئے ہونٹ، جو ہمیشہ نمی میں ڈوبے رہتے اور جسم میں سے عجیب گھبرانے والی بو کے شرارے نکلتے رہتے تھے۔ اور یہ ننھے ننھے پُھولے ہوئے ہاتھ کس قدر پھرتیلے تھے، ابھی کمر پر، تو وہ لیجئے پھسل کر گر گئے کولھوں پر، وہاں سے رپٹے رانوں پر، اور پھر دوڑ ٹخنوں کی طرف۔ میں تو جب کبھی بیگم جان کے پاس بیٹھتی یہی دیکھتی کہ اب اس کے ہاتھ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

گرمی جاڑے بیگم جان حیدر آبادی جالی کارگے کے کُرتے پہنتیں۔ گہرے رنگ کے پاجامے اور سفید جھاگ سے کُرتے اور پنکھا بھی چلتا ہو، پھر بھی وہ ہلکی دُلائی ضرور جسم پر ڈھکے رہتی تھیں۔ انھیں جاڑا بہت پسند تھا۔ جاڑے میں مجھے اُن کے یہاں اچھا معلوم ہوتا۔ وہ ہلتی جلتی بہت کم تھیں۔ قالین پر بیٹھی ہیں۔ پیٹھ کھج رہی ہے، خشک میوے چبا رہی ہیں اور بس۔ ربّو سے دوسری ساری نوکرانیاں خار کھاتی تھیں۔ چڑیل بیگم جان کے ساتھ کھاتی، ساتھ اٹھتی بیٹھتی، اور ماشاء اللہ ساتھ ہی سوتی تھی، ربو اور بیگم جان عام جلسوں اور محفلوں کی دلچسپ گفتگو کا موضوع تھیں، جہاں ان دونوں کا ذکر آیا اور قہقہے اُٹھے۔ لوگ نہ جانے کیا کیا چٹکلے غریب پر اُڑاتے۔ مگر وہ دُنیا میں کسی سے ملتی ہی نہ تھیں۔ وہاں تو بس وہ تھیں اور ان کی کھجلی۔

میں نے کہا کہ اُس وقت میں کافی چھوٹی تھی اور بیگم جان پر فدا۔ وہ بھی مجھے بہت ہی پیار کرتی تھیں۔ اتّفاق سے امّاں آگرہ گئیں۔ اُنھیں معلوم تھا کہ اکیلے گھر میں بھائیوں سے مار کٹائی ہو گی، ماری ماری پھروں گی، اس لیے وہ ہفتہ بھر کے لیے مجھے بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ میں بھی خوش اور بیگم جان بھی خوش۔ آخر کو امّاں کی بہن بنی ہوئی تھیں۔

سوال یہ اُٹھا کہ میں سوؤں کہاں؟ قدرتی طور پر بیگم جان کے کمرے میں۔ لہٰذا

میرے لیے بھی اُن کے چھپر کھٹ سے لگا کر چھوٹی سی پلنگڑی ڈال دی گئی۔ دس گیارہ بجے تک تو باتیں کرتے رہے۔ میں اور بیگم جان چانس کھیلتے رہے اور پھر میں سونے کے لیے اپنے پلنگ پر چلی گئی۔ اور جب میں سوئی تو ربو ویسے ہی بیٹھی ان کی پیٹھ کھجا رہی تھی۔ ''بھنگن کہیں کی'' میں نے سوچا۔ رات کو میری ایک دم سے آنکھ کھلی تو مجھے عجیب طرح کا ڈر لگنے لگا۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا۔ اور اس اندھیرے میں بیگم جان کا لحاف ایسے ہل رہا تھا جیسے اس میں ہاتھی بند ہو ''بیگم جان!'' میں نے ڈری ہوئی آواز نکالی، ہاتھی ہلنا بند ہو گیا۔ لحاف نیچے دب گیا۔

''کیا ہے..... سو رہو.....'' بیگم جان نے کہیں سے آواز دی۔

''ڈر لگ رہا ہے.....'' میں نے چوہے کی سی آواز سے کہا۔

''سو جاؤ..... ڈر کی کیا بات ہے..... آیت الکرسی پڑھ لو۔''

''اچھا.....'' میں نے جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھی..... مگر یعلم مابین پر آکر ہر دفعہ اٹک گئی۔ حالانکہ مجھے اس وقت پوری آیت یاد ہے۔

''تمھارے پاس آجاؤں بیگم جان.....''

''نہیں..... بیٹی..... سو رہو.....'' ذرا سختی سے کہا۔

اور پھر دو آدمیوں کے کھسر پھسر کرنے کی آواز سنائی دینے لگی..... ہائے رے یہ دوسرا کون؟ میں اور بھی ڈری۔

''بیگم جان..... چور وور تو نہیں۔''

''سو جاؤ بیٹا..... کیسا چور.....'' ربو کی آواز آئی۔ میں جلدی سے لحاف میں منہ ڈال کر سو گئی۔

صبح سویرے میرے ذہن میں رات کے خوفناک نظارے کا خیال بھی نہ رہا۔ میں ہمیشہ کی وہمی ہوں۔ رات کو ڈرنا، اُٹھ اُٹھ کر بھاگنا اور بڑبڑانا تو بچپن میں روز ہی ہوتا تھا۔ سب تو کہتے تھے مجھ پر بھوتوں کا سایہ ہو گیا ہے، لہٰذا مجھے خیال بھی نہ رہا۔ صبح کو لحاف بالکل معصوم نظر آرہا تھا۔ مگر دوسری رات میری آنکھ جب کھلی تو ربو اور بیگم

جان میں کچھ جھگڑا بڑی خاموشی سے چھپر کھٹ پر ہی طے ہو رہا تھا اور میری خاک سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا فیصلہ ہوا۔ ربو ہچکیاں لے کر روئی۔ پھر بلّی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں..... اُونھ میں تو گھبرا کر سو گئی۔

آج ربو اپنے بیٹے سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہ بڑا جھگڑالو تھا۔ بہت کچھ بیگم جان نے کیا۔ اسے دوکان کرائی..... گاؤں میں لگوایا۔ مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ نواب صاحب کے یہاں کچھ دن رہا۔ خوب جوڑے جامے بھی بنے پر نہ جانے کیوں ایسا بھاگا کہ ربو سے ملنے بھی نہ آتا..... لہٰذا ربو ہی اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں اس سے ملنے گئی تھی۔ بیگم جان نہ جانے دیتیں۔ مگر ربو بھی مجبور ہو گئی۔

سارا دن بیگم پریشان رہیں۔ ان کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا رہا۔ کسی کا چھونا بھی انھیں نہ بھاتا تھا۔ انھوں نے کھانا بھی نہ کھایا اور سارا دن اُداس پڑی رہیں۔

''میں کھجا دوں بیگم جان.....'' میں نے بڑے شوق سے تاش کے پتے بانٹتے ہوئے کہا۔ بیگم جان غور سے مجھے دیکھنے لگیں۔

''میں کھجا دوں..... سچ کہتی ہوں.....'' میں نے تاش رکھ دیے۔

میں تھوڑی دیر تک کھجاتی رہی اور بیگم جان چپکی لیٹی رہیں۔ دوسرے دن ربو کو آنا تھا، مگر وہ آج بھی غائب تھی۔ بیگم جان کا مزاج چڑچڑا ہوتا گیا..... چائے پی پی کر انھوں نے سر میں درد کر لیا۔

میں پھر کھجانے لگی اُن کی پیٹھ..... چکنی میز کی تختی جیسی پیٹھ..... میں ہولے ہولے کھجاتی رہی۔ ان کا کام کر کے کیسی خوشی ہوتی تھی!

''ذرا زور سے کھجاؤ..... بند کھول دو.....'' بیگم جان بولیں۔ ''ادھر..... اے ہے ذرا شانے کے نیچے..... ہاں..... واہ بھئی..... ہا..... ہا'' وہ سرور میں ٹھنڈی سانسیں لے کر اطمینان ظاہر کرنے لگیں۔

''اور ادھر.....'' حالانکہ بیگم جان کا ہاتھ خوب جا سکتا تھا مگر وہ مجھ سے ہی کھجوا رہی تھیں اور مجھے الٹا فخر ہو رہا تھا۔ ''یہاں..... اُوئی..... تم تو گدگدی کرتی ہو۔

واہ....." وہ ہنسیں۔ میں باتیں بھی کر رہی تھی اور کھجا بھی رہی تھی۔

"تمھیں کل بازار بھیجوں گی..... کیالو گی..... وہی سوتی جاگتی گڑیا....."

"نہیں بیگم جان..... میں تو گڑیا نہیں لیتی..... کیا بچہ ہوں اب میں۔"

"بچہ نہیں تو کیا بوڑھی ہو گئی ہو....." وہ ہنسیں..... "گڑیا نہیں تو ببوا لینا..... کپڑے پہنانا خود..... میں دوں گی تمھیں بہت سے کپڑے، سنا۔" انھوں نے کروٹ لی۔

"اچھا۔" میں نے جواب دیا۔

"ادھر....." انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر جہاں کھجلی ہو رہی تھی رکھ دیا۔ جہاں انھیں کھجلی معلوم ہوتی وہاں میرا ہاتھ رکھ دیتیں اور میں بے خیالی میں ببوے کے دھیان میں ڈوبی مشین کی طرح کھجاتی رہی اور وہ متواتر باتیں کرتی رہیں۔

"سنو تو، تمھاری فراکیں کم ہو گئی ہیں۔ کل درزی کو دے دوں گی کہ نئی سی لائے۔ تمھاری اماں کپڑا دے گئی ہیں۔"

"وہ لال کپڑے کی نہیں بنواؤں گی..... چماروں جیسا ہے....." میں بکواس کر رہی تھی اور ہاتھ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا..... باتوں باتوں میں مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔ بیگم جان تو چت لیٹی تھیں..... "ارے....." میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"اُوئی لڑکی..... دیکھ کر نہیں کھجاتی..... میری پسلیاں نوچے ڈالتی ہے۔" بیگم جان شرارت سے مسکرائیں اور میں جھینپ گئی۔

"ادھر آکر میرے پاس لیٹ جا....." انھوں نے مجھے بازو پر سر رکھ کر لٹایا۔

"اے ہے کتنی سوکھ رہی ہے..... پسلیاں نکل رہی ہیں۔" انھوں نے میری پسلیاں گننا شروع کر دیں۔

"اُوں....." میں منمنائی۔

"اُوئی..... تو کیا میں کھا جاؤں گی..... کیسا تنگ سوئیٹر بُنا ہے!"

"گرم بنیان بھی نہیں پہنا تم نے....." میں کلبلانے لگی۔

"کتنی پسلیاں ہوتی ہیں....." انھوں نے بات بدلی۔

"ایک طرف نو اور دوسری طرف دس۔" میں نے اسکول میں یاد کی ہوئی ہائی جین کی مدد لی۔ وہ بھی اُوٹ پٹانگ۔

"ہٹاؤ تو ہاتھ..... ہاں، ایک..... دو..... تین....."

میرا دل چاہا کسی طرح بھاگوں..... اور انھوں نے زور سے بھینچا۔

"اُوں....." میں مچل گئی..... بیگم جان زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اب بھی جب کبھی میں اُن کا اس وقت کا چہرہ یاد کرتی ہوں تو دل گھبرانے لگتا ہے۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے اور وزنی ہو گئے۔ اوپر کے ہونٹ پر سیاہی گھری ہوئی تھی۔ باوجود سردی کے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ہونٹوں اور ناک پر چمک رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھ ٹھنڈے یخ تھے۔ مگر نرم نرم جیسے اُن پر کی کھال اُتر گئی ہو۔ انھوں نے شال اُتار دی تھی اور کارگے کے مہین کُرتے میں اُن کا جسم آٹے کی لوئی کی طرح چمک رہا تھا۔ بھاری جڑاؤ سونے کے بٹن گریبان کے ایک طرف جھول رہے تھے۔ شام ہو گئی تھی اور کمرے میں اندھیرا گھُٹ رہا تھا۔ مجھے ایک نامعلوم ڈر سے وحشت سی ہونے لگی۔ بیگم جان کی گہری گہری آنکھیں۔ میں رونے لگی دل میں۔ اور وہ مجھے ایک مٹی کے کھلونے کی طرح بھینچ رہی تھیں۔ اُن کے گرم گرم جسم سے میرا دل بولانے لگا۔ مگر اُن پر تو جیسے کوئی بھتنا سوار تھا اور میرے دماغ کا یہ حال کہ نہ چیخا جائے اور نہ رو سکوں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پست ہو کر نڈھال لیٹ گئیں۔ اُن کا چہرہ پھیکا اور بدرونق ہو گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔ میں سمجھی کہ اب مریں یہ، اور وہاں سے اُٹھ کر سرپٹ بھاگی باہر.....!

شکر ہے کہ ربو رات کو آگئی اور میں ڈری ہوئی جلدی سے لحاف اوڑھ کر سو گئی، مگر نیند کہاں۔ چپ گھنٹوں پڑی رہی۔

اماں کسی طرح آہی نہیں چکی تھیں۔ بیگم جان سے مجھے ایسا ڈر لگتا تھا کہ میں سارا دن ماماؤں کے پاس بیٹھی رہی۔ مگر اُن کے کمرے میں قدم رکھتے دم نکلتا تھا اور کہتی کس سے اور کہتی ہی کیا کہ بیگم جان سے ڈر لگتا ہے؟ اور وہ بیگم جان جو میرے اُوپر

جان چھڑکتی تھیں۔

-x-x-

آج ربو میں اور بیگم جان میں پھر ان بن ہو گئی..... میری قسمت کی خرابی کہیے یا کچھ اور، مجھے اُن دونوں کی ان بن سے ڈر لگا۔ کیونکہ فوراً ہی بیگم جان کو خیال آیا کہ میں باہر سردی میں گھوم رہی ہوں اور مروں گی نمونیہ میں۔

"لڑکی کیا میرا سر منڈوائے گی۔ جو کچھ ہو ہوا گیا تو اور آفت آئے گی۔" انھوں نے مجھے پاس بٹھالیا۔ وہ خود منھ ہاتھ سلفچی میں دھو رہی تھیں۔ چائے تپائی پر رکھی تھی۔

"چائے تو بناؤ..... ایک پیالی مجھے بھی دینا....." وہ تولیہ سے منھ خشک کر کے بولیں..... "میں ذرا کپڑے بدل لوں۔"

وہ کپڑے بدلتی رہیں اور میں چائے پیتی رہی۔ بیگم جان نائن سے پیٹھ ملواتے وقت اگر مجھے کسی کام سے بُلاتیں تو میں گردن موڑے موڑے جاتی، اور واپس بھاگ آتی۔ اب جو انھوں نے کپڑے بدلے تو میرا دل الٹنے لگا۔ منھ موڑے میں چائے پیتی رہی۔

"ہائے اماں....." میرے دل نے بے کسی سے پکارا۔ "آخر ایسا میں بھائیوں سے کیا لڑتی ہوں جو تم میری مصیبت....." اماں کو ہمیشہ سے میرا لڑکوں کے ساتھ کھیلنا ناپسند ہے، کہو بھلا لڑکے کیا شیر چیتے ہیں جو نگل جائیں گے اُن کی لاڈلی کو۔ اور لڑکے بھی کون؟ خود بھائی اور دو چار سڑے سڑائے ذرا ذرا سے ان کے دوست۔ مگر نہیں وہ تو عورت ذات کو سات تالوں میں رکھنے کی قائل اور یہاں بیگم جان کی وہ دہشت کہ دنیا بھر کے غنڈوں سے نہیں۔ بس چلتا تو اس وقت سڑک پر بھاگ جاتی پر وہاں نہ ٹکتی۔ مگر لاچار تھی۔ مجبوراً کلیجے پر پتھر رکھے بیٹھی رہی۔

کپڑے بدل سولہ سنگھار ہوئے اور گرم گرم خوشبوؤں کے عطر نے اور بھی انھیں انگارہ بنادیا اور وہ چلیں مجھ پر لاڈ اُتارنے۔

"گھر جاؤں گی....." میں نے اُن کی ہر لاڈ کے جواب میں کہا اور رونے لگی۔

"میرے پاس تو آؤ میں..... تمھیں بازار لے چلوں گی..... سنو تو....."

مگر میں کھلی کی طرح پھیل گئی..... سارے کھلونے، مٹھائیاں ایک طرف اور گھر جانے کی رٹ ایک طرف۔

"وہاں بھیا ماریں گے..... چڑیل....." اُنھوں نے پیار سے مجھے تھپڑ لگایا۔

"پڑے ماریں بھیا....." میں نے دل میں سوچا۔ اور روٹھی اکڑی بیٹھی رہی۔

"کچی امیاں کھٹی ہوتی ہیں بیگم جان....." جلی کٹی ربو نے رائے دی۔ اور پھر اس کے بعد بیگم جان کو دورہ پڑ گیا۔ سونے کا ہار جو وہ تھوڑی دیر پہلے مجھے پہنا رہی تھیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مہین جالی کا دوپٹہ تار تار۔ اور وہ مانگ جو میں نے کبھی بگڑی نہ دیکھی تھی جھاڑ جھنکاڑ ہو گئی۔

"اُوہ..... اُوہ..... اُوہ..... اُوہ....." وہ جھٹکے لے لے کر چلانے لگیں۔ میں رپٹی باہر۔

بڑے جتنوں سے بیگم جان کو ہوش آیا۔ جب میں سونے کے لیے کمرے میں دبے پیر جا کر جھانکی تو ربو ان کی کمر سے لگی جسم دبا رہی تھی۔

"جوتی اُتار دو....." اس نے اُن کی پسلیاں کھجاتے ہوئے کہا اور میں چوہیا کی طرح لحاف میں دبک گئی۔

"سرسر پھٹ کچ....." بیگم جان کا لحاف اندھیرے میں پھر ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔

"اللہ! آں....." میں نے مری ہوئی آواز نکالی۔ لحاف میں ہاتھی پھدکا اور بیٹھ گیا۔ میں بھی چپ ہو گئی۔ ہاتھی نے پھر لوٹ مچائی۔ میرا رُواں رُواں کانپا۔ آج میں نے دل میں ٹھان لیا کہ ضرور ہمت کر کے سرہانے کا لگا ہوا بلب جلادوں۔ ہاتھی پھر پھڑپھڑا رہا تھا اور جیسے اُکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چپڑ چپڑ کچھ کھانے کی آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی مزے دار چٹنی چکھ رہا ہو۔ اب میں سمجھی! یہ بیگم جان نے آج

کچھ نہیں کھایا۔ اور ربو مردی تو ہے سدا کی چٹو۔ ضرور یہ ترمال اُڑا رہی ہے۔ میں نے نتھنے پھلا کر "سوں سوں" ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر صندل اور حنا کی گرم گرم خوشبو کے اور کچھ نہ محسوس ہوا۔

لحاف پھر اُمنڈنا شروع ہوا۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ چپکی پڑی رہوں۔ مگر اس لحاف نے تو ایسی عجیب عجیب شکلیں بنانی شروع کیں کہ میں لرز گئی۔ معلوم ہوتا تھا غوں غوں کر کے کوئی بڑا سا مینڈک پھول رہا ہے اور اب اچھل کر میرے اُوپر آیا۔

"آ..... ن..... اماں ....." میں ہمت کر کے گنگنائی۔ مگر وہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی اور لحاف میرے دماغ میں گھس کر پھولنا شروع ہوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پلنگ کے دوسری طرف پیر اُتارے اور ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبایا۔ ہاتھی نے لحاف کے نیچے ایک قلابازی لگائی اور پچک گیا۔ قلابازی لگانے میں لحاف کا کونا فٹ بھر اُٹھا..... اللہ! میں غڑاپ سے اپنے بچھونے میں!

دو ہاتھ

رام اوتار لام سے واپس آرہا تھا۔ بوڑھی مہترانی ابا میاں سے چٹھی پڑھوانے آئی تھی۔ رام اوتار کو چھٹی مل گئی۔ جنگ ختم ہو گئی تھی نا؟ اس لیے رام اوتار تین سال بعد واپس آرہا تھا۔ بوڑھی مہترانی کی چیپڑ بھری آنکھوں میں آنسو ٹمٹما رہے تھے، مارے شکر گزاری کے وہ دوڑ دوڑ کر سب کے پاؤں چھو رہی تھی۔ جیسے ان پیروں کے مالکوں نے ہی اس کا اکلوتا پوت لام سے زندہ سلامت منگوالیا۔

بڑھیا پچاس برس کی ہو گی، پر ستر کی معلوم ہوتی تھی۔ دس بارہ کچے پکے بچے جنے، ان میں سے بس رام اوتروا بڑی منتوں، مرادوں سے جیا تھا۔ ابھی اس کی شادی رچائے سال بھر بھی نہیں بیتا تھا کہ رام اوتار کی پکار آگئی۔ مہترانی نے بہت واویلا مچائی مگر کچھ نہ چلی اور جب رام اوتار وردی پہن کر آخری بار اس کے پیر چھونے آیا تو اس کی شان و شوکت سے بے انتہا مرعوب ہوئی، جیسے وہ کرنل ہی تو ہو گیا تھا۔

شاگرد پیشے میں نوکر مسکرا رہے تھے۔ رام اوتار کے آنے کے بعد جو ڈرامہ ہونے کی امید تھی، سب اسی پر آس لگائے بیٹھے تھے۔ حالانکہ رام اوتار لام پر توپ بندوق چھوڑنے نہیں گیا تھا، پھر بھی سپاہیوں کا میلا اٹھاتے اٹھاتے اس میں کچھ سپاہیانہ آن بان اور اکڑ پیدا ہو گئی ہو گی۔ بھوری وردی ڈانٹ کر وہ پرانا رام اوتروا واقعی نہ رہا ہو گا۔ ناممکن ہے وہ گوری کے کرتوت سنے اور اس کا جوان خون ہتک سے کھول نہ اٹھے۔

بیاہ کر آئی ہے تو کیا مسمسی تھی گوری۔ جب تک رام اوتار رہا اس کا گھونگھٹ فٹ بھر لمبا رہا اور کسی نے اس کے رُخ پر نور کا جلوہ نہ دیکھا۔ جب خصم گیا تو کیا بلک